اسلامی معاشیات کی گم شدہ جنّت

محمد منیر احمد ○

یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے کہ جب کارل مارکس کا معاشی نظام، اشتراکیت، روس میں فروغ پا رہا تھا۔ اس نظام سے مغرب کی سرمایہ دار حکومتیں خائف تھیں۔ اس زمانے میں، جب چاروں طرف اشتراکی لہر کا شور تھا۔ اقبال ایک بہت بڑا دعویٰ کرتے ہیں ع

مزدکیّت فتنۂ فردا نہیں ، اسلام ہے

قدیم ایران میں مزدک نامی ایک شخص گزرا ہے، جس نے سب سے پہلے اجتماعی ملکیت (زر، زمین اور زن) کا تصور پیش کیا۔ علامہ اقبال اشتراکیت کو 'مزدکیت' کے نام سے پکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرمایہ داری کا اصل مقابلہ اسلام سے ہوگا۔ اس وقت کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اشتراکیت کا خاتمہ ہوجائے گا اور سرمایہ داری کا اصل مقابلہ اسلامی نظام سے ہوگا، مگر آج یہ ایک حقیقت ہے کیونکہ ۱۹۹۰ء میں اشتراکیت کا سورج ڈوب گیا اور 'تہذیبوں کے تصادم' کا نظریہ پیش کرتے ہوئے مغربی مفکرین نے پکارا کہ مغربی تہذیب سے اصل مقابلہ اسلامی تہذیب ہی کا ہے۔ اس نکتے کو سردست یہاں چھوڑ کر اقبال کے اس شعر پر غور وفکر کرتے ہیں:

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک　　اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

'قُلِ الْعَفْوَ' قرآن کے دو الفاظ ہیں۔ ان الفاظ میں کون سی حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ جس کے نمودار ہونے کے اقبال منتظر ہیں؟ دراصل یہاں بھی اقبال بہت بڑے راز سے پردہ اُٹھانے والے ہیں۔ کیونکہ اس شعر سے پہلے وہ قرآن کا ذکر کرتے ہیں ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں　　اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

○ سابق چیف مینیجر اسٹیٹ بنک آف پاکستان۔ مصنف: مدینہ اکنامکس

مَاذَا يُنْفِقُوْنَ؟ تاریخِ انسانی کا منفرد سوال

اگرچہ اسلام کا ظہور مکّہ میں ہوا، اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے بعد ۱۳ سال مکّہ میں گزارے، مگر وہاں اسلامی معاشرے کی تشکیل نہ ہوسکی، کیونکہ مکّے کے قریش تو مسلمانوں کی جان کے دشمن تھے۔ یہ اعزاز مدینے کے حصّے میں آیا۔ قرآن نے ہجرت کے دوران نازل ہونے والی سورۃ الحج میں اس کی نشان دہی کردی تھی:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط (الحج ۲۲:۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بُرائی سے منع کریں گے۔

اب چونکہ اسلامی معاشرے کے قیام کا وقت آگیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ایک طرح سے ریاستِ مدینہ کے خدوخال بیان کردیے۔ ہجرت کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب سے اسلامی معاشرے کی بنیادیں اُٹھائیں۔ صلوٰۃ کے نظام کے لیے مسجد نبویؐ، قریش اور انصار کے درمیان مواخات اور میثاقِ مدینہ جیسے اقدام کیے۔ ان چیزوں سے ہم واقف ہیں، مگر ان کاموں سے فارغ ہوکر آپؐ نے معاشی نظام کی بھی تکمیل کی تھی، جس سے ہم اکثر وبیش تر غافل اور بے خبر رہے۔ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ؛ (ہم کیا خرچ کریں؟) ایک ایسا سوال ہے جو ریاستِ مدینہ کے معاشی نظام کے تناظر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تھا۔ دراصل ریاستِ مدینہ کے معاشی نظام کا ایک مقصد 'مشترکہ خوش حالی' (Shared Prosperity) کا حصول تھا، جس کے باعث ایمان داری اور باہمی فلاح پر مبنی معاشی جدوجہد وجود میں آئی۔

اگر ہم مدنی زندگی کے ۱۰ برسوں کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لیں، تو سیرتِ نبویؐ کے حیران کن پہلو سامنے آتے ہیں۔ ہجرت کے پہلے سال ہی آپؐ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر مکمل کرلی۔ مواخات اور میثاقِ مدینہ ہوا۔ زکوٰۃ بھی اسی سال فرض ہوئی اور آپؐ نے معاشی نظام کا نفاذ شروع کرنے کے لیے پہلی اسلامی مارکیٹ قائم کی۔ عبداللہ بن ابی کی مخالفت بھی اسی سال میں شروع ہوئی۔ اگلے چار سال بیرونی جارحیت اور اندرونی سازشوں کے ہیں۔ انھی پانچ برسوں میں قریشِ مکّہ کے حملوں

(بدر، اُحد اور خندق) اور یہودیوں کی ریشہ دوانیوں کا سدباب کیا گیا۔

اسی دوران میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں سیاسی اور معاشی نظام کے نفاذ کی تکمیل بھی کی۔ یہ پانچ سال بنیادی اصلاحات (reformation) کا دور ہے، جس کے اثرات آنے والے برسوں میں ظاہر ہونا شروع ہوئے۔ چھٹی ہجری میں کفّارِ مکّہ کے ساتھ صلح حدیبیہ ہوئی اور ساتویں صدی ہجری میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے بادشاہوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت پر مبنی خطوط بھیجنا شروع کیے۔ غالباً اسی عرصے میں کئی صحابہؓ نے سوال پوچھا کہ ''ہم اپنی آمدنی سے (زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد) دوسروں پر کیا خرچ کریں؟'' اس سوال کا جواب قرآن نے یوں دیا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرہ ۲:۲۱۹) اے نبیؐ! لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو: ''جو کچھ تمھاری ضروریات سے زیادہ ہو''۔

یہاں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ انسانی میں اہلِ ثروت کی طرف سے ایسا سوال کبھی نہیں پوچھا گیا۔ اس کی بڑی وجہ قبل از اسلام تجارت کے طور طریقے تھے، جن کے باعث تجارت، لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا ذریعہ بن چکی تھی۔ معاشرے میں تاجر کے پیشے کی عزّت نہ تھی۔ قدیم یونان میں اگرچہ علم و دانش کی عمل داری تھی، مگر تجارت اور تاجر کا معاشرے میں کوئی مقام نہ تھا۔ اس دور میں ہر طبقے کے لوگوں کا اپنا اپنا خدا تھا، مگر چور، ڈاکو اور تاجر کا ایک ہی خدا (Hermes) تھا۔ یونان کے لوگ تو فلسفہ اور عقل و دانش کے دلدادہ تھے، مگر چور، ڈاکو اور تاجر کو ایک ہی صف میں کھڑا کرنے کی بڑی وجہ ڈکیتی نما تجارت تھی، جس میں تاجر دھوکا دہی اور فریب سے اشیا کی خرید و فروخت کرتے تھے۔

ساتویں صدی کی ریاستِ مدینہ کے معاشی نظام کا یہ اعزاز ہے کہ اس نے تجارت اور تاجر کو عزّت و احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ تجارت کو ایک معزز پیشہ بنایا اور تاجر کو معاشرے کا معزز ترین فرد قرار دیا۔ اس سلسلے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ مارکیٹ (منڈی) حرم کی مانند ہے یعنی مسلمان کی زندگی میں مارکیٹ مسجد کی طرح اہم اور پاک ہے۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بازار (مارکیٹ) شیطان سے مقابلے کی جگہ ہے، یعنی زیادہ منافع کی ہوس سے بچا جاسکے۔ سچے تاجر کے رُتبے کے بارے میں فرمانِ رسولؐ نے گویا نجات کا راستہ

دکھا دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ سچے تاجر کا رُتبہ شہدا اور صالحین کے بعد ہے۔ بڑی غور طلب بات ہے کہ ایسا فرمان، طبیب (Doctor) یا کسی اور پروفیشن کے بارے میں نہیں ہے۔ اس حدیث میں پیغمبرانہ بصیرت اور دُور رس پیغام اور دعوت پوشیدہ ہے۔

دورِ حاضر میں تجارت کی تعریف اشیا اور خدمات (goods and services) کی خرید و فروخت کے حوالے سے کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں بازار میں روزمرہ کے استعمال کی چیزیں فروخت کرنے والا شخص ہی تاجر نہیں بلکہ خدمات مہیا کرنے والے ڈاکٹر، وکیل اور استاد وغیرہ سب تاجر کے زُمرے میں آتے ہیں۔ اگر یہ سب لوگ دیانت دار ہوجائیں تو انسانی زندگی اس کرۂ ارض پر خوش حالی اور امن کی ضامن بن جائے اور ایسا ہی ساتویں صدی کی ریاستِ مدینہ میں ہوا تھا۔ جب معاشی جدوجہد میں کامیاب ہونے والے لوگوں نے معاشرے کے ان افراد کے بارے میں سوچا، جو زندگی کی معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے تھے۔ قرآن نے قُلِ الْعَفْوَ کے مختصر مگر خوب صورت جواب میں معاشیات کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ اقبال نے اسی پوشیدہ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

قُلِ الْعَفْوَ کی حقیقت

معاشی جدوجہد انسانی زندگی کا لازمی جزو ہے اور ہر فرد اپنی صلاحیتوں، ارادے اور دستیاب ماحول کے مطابق حصولِ معاش کی کوشش کرتا ہے مگر معاشی تگ و دو کے ثمرات یکساں اور ہموار نہیں ہیں۔ معاشی دوڑ دھوپ کے نتیجے میں کچھ لوگ بہت آگے نکل جاتے ہیں، جب کہ معاشرے کا بڑا حصّہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ سادہ الفاظ میں معاشی جدوجہد کے باعث قدرِ زائد (Surplus Value) تو پیدا ہوتی ہے، جسے اکنامکس کی زبان میں بڑھوتری (Growth) کہتے ہیں مگر اس کی منصفانہ تقسیم (Judicious Distribution) معاشی نظام کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ منصفانہ تقسیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دستیاب بڑھوتری (Given growth) کو معاشرے کے سارے افراد میں یکساں طور پر تقسیم کر دیا جائے بلکہ معاشی دوڑ دھوپ کے لیے ایسا سازگار ماحول (Enabling environment) پیدا کر دیا جائے، جس میں معاشی ثمرات ممکن حد تک سارے معاشرے تک پہنچائے جاسکیں۔ دورِ حاضر کی زبان میں اسے مشترکہ خوش حالی یا مربوط معاشی ترقی کہتے ہیں۔

قدرِ زائد یا بڑھوتری کی تین بڑی بنیادی وجوہ ہیں، جن میں دو تو فطری ہیں اور تیسری انسانی۔

دنیا کے مختلف علاقوں میں وسائل کے حوالے سے فطری ودیعت (Natural Endowment) مختلف ہے۔ کچھ علاقے معدنی دولت (تیل، سونا اور ایسی دوسری اشیا) سے مالا مال ہیں، جب کہ کچھ محروم۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی استعداد اور میلان طبیعت (Aptitude) کے باعث ایک جیسی نہیں ہے۔ اس فطری غیرہمواری کے باعث کچھ علاقے/ملک دوسرے علاقوں/ملکوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اور ایک ہی علاقہ میں کچھ لوگ دوسروں سے زیادہ خوش حال ہوجاتے ہیں۔

قدرِ زائد کی افزایش کی تیسری شکل انسانی ہے، یعنی سود کا کاروبار جس کے باعث سرمایہ کے ثمرات (return on capital) چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے باعث دولت کی تقسیم انتہائی غیرہموار ہوجاتی ہے جیسا کہ دورِ حاضر کی معاشی ترقی سے ظاہر ہے۔ قدرِ زائد کی منصفانہ تقسیم کا انتظام آج کی معاشیات کا سب سے اہم مسئلہ ہے، جسے ہم انسانیت کے تینوں معاشی نظام (مدینہ اکنامکس، سرمایہ داری اور اشتراکیت) کی زبان میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

سرمایہ داری کی بنیاد سودی کاروبار اور Survival of the Fittest ہے۔ سودی کاروبار کی دو بڑی قباحتیں ہیں: ایک تو پیداواری عمل میں سرمایہ کا معاوضہ بطورِ سود دوسرے عاملینِ پیداوار (زمین، محنت اور آجر) سے زیادہ ہے۔ مشہور معاشیات دان تھامس پکٹی نے یہ بات معاشی اعداد و شمار سے ثابت کی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو کوئی اپنے زورِ بازو سے جس قدر کما لے وہ سب اس کا ہے۔

چونکہ سود کے کاروبار میں دوسرے عاملینِ پیداوار (خاص طور پر محنت) کا استحصال ہے، اس لیے ضروری تھا کہ Survival of the Fittest کے نظریے کا سہارا لیا جائے تاکہ دھوکا، فریب اور استحصال کے ذریعے کمائی ہوئی دولت چھپائی جاسکے اور اس کا ارتکاز ہوسکے۔ لہٰذا سرمایہ داری نظام میں قُلِ الْعَفْوَ جیسا سوال نہ پوچھا جاسکتا ہے اور نہ کبھی پوچھا گیا۔ سودی کاروبار کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آخرکار یہ ساری انسانی زندگی کو اپنے کنٹرول میں لے لیتا ہے۔ معاشی نظام کے نفاذ کے لیے حکومت کے ادارے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے معاشی نظام سیاسی نظام کے تحت ہوتا ہے۔ غالباً اسی لیے شروع میں اکنامکس کے مضمون کو Political Economy کہا جاتا تھا۔ چونکہ پچھلے ۵۰۰ برس سے سودی کاروبار سماجی و معاشی زندگی کا مرکز و محور ہے، اس لیے اس عرصے میں سودی کاروبار نے وہ زری طاقت (Money Might) حاصل کرلی ہے جس سے حکومت کی

فیصلہ سازی کے عمل کو کنٹرول کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضر کا سودی کاروبار حکومت کے تحفظ میں پرورش پاتا ہے۔ ۲۰۰۸ء کے مالی بحران کے بعد مغرب کے ترقی یافتہ مگر سود زدہ ممالک کے دانش ور اب ایسی باتیں کررہے ہیں، جیسا کہ ۲۰۱۴ء میں شائع ہونے والی کتاب *Barren Metal: A History of Capitalism as the Conflict between Labour and Usury* کے نام سے ظاہر ہے۔ کتاب کے مصنف ای مائیکل جان کہتے ہیں کہ: Capitalism is state-sponsored usury۔ سادہ الفاظ میں سرمایہ داری حکومتی تحفظ میں سود کا کاروبار ہے۔ آج کل امریکا اور یورپ میں 'مشترکہ خوش حالی' (Shared Prosperity) کا بہت شوروغوغا ہے مگر نظامِ سرمایہ داری اس کا حامل نہیں ہے۔

قدرِزائد کی منصفانہ تقسیم اشتراکیت میں انتہائی صورت میں سامنے آئی۔ اٹھارھویں صدی کے صنعتی انقلاب سے اگرچہ معاشی ترقی کے سارے پرانے ریکارڈ ٹوٹ گئے، مگر ایک سو سال بعد ہی دولت کی انتہائی غیرمساوی تقسیم اور اس کے نتیجے میں وجود پذیر ہونے والی غربت اور مزدور کی کسمپرسی اور زبوں حالی نے انسانیت کے تیسرے معاشی نظام، اشتراکیت کو جنم دیا۔ اس نظام کے بانی کارل مارکس کا کہنا تھا کہ ''پیداواری عمل میں محنت بہت اہم عامل پیداوار (factor of production) ہے جس کے باعث قدرِزائد پیدا ہوتی ہے مگر قدرِزائد کا زیادہ حصّہ سرمایہ لے جاتا ہے''۔

اس صورتِ حال کی وضاحت کے لیے کارل مارکس نے نظریہ قدرِزائد اور نظریۂ اجنبیت اور بیگانگی (Theory of Alleniation) پیش کیے۔ یہ دونوں نظریے مزدور (have nots) کے بارے میں تھے۔ پہلے نظریے کے مطابق مزدور کو پیداوار کے عمل میں مناسب حصّہ نہیں ملتا کیونکہ سرمایہ دار سرمایہ کے زور پر پیداوار کا بڑا حصّہ لے جاتا ہے جس سے غربت میں تسلسل کے باعث امیر اور غریب کی خلیج بڑھتی جاتی ہے۔ غریب آدمی کی ساری زندگی پیٹ کے دوزخ کو بھرنے میں گزر جاتی ہے اور وہ اعلیٰ انسانی اقدار سے اجنبی اور بیگانہ ہوجاتا ہے۔ یہ نظریۂ اجنبیت اور بیگانگی ہے۔ انسانی غربت اور اجنبیت کو ختم کرنے کے لیے کارل مارکس نے تمام ذرائع دولت کو حکومتی کنٹرول میں لینے کی بات کی جس پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد ۱۹۱۷ء سے روس میں عمل ہوا۔ دراصل یہ قدرِزائد کو نظم میں لانے کی کوشش تھی جس کا نعرہ تھا: ''ہر ایک کو اس کی ضرورت اور

صلاحیت کے مطابق ملے‘‘۔ یہ کوشش حقیقت میں معاشی ثمرات کو جبری طور پر تمام انسانوں میں برابر برابر تقسیم کرنے کا ایک غیرفطری عمل تھا۔ شروع کی کچھ کامیابیوں کے بعد یہ نظام ۷۰ سال کے قلیل عرصے میں ہی زمین بوس ہوگیا۔

قُلِ الْعَفْوَ کا حصول ایسے ماحول کا متقاضی ہے جس میں ایک طرف افراد کو معاشی جدوجہد کی آزادی ہو، وہ محنت اور جانفشانی سے کام کریں اور منافع حاصل کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے افراد اخلاقی اقدار کے بھی حامل ہوں، جس کے تحت وہ محنت سے کمائی ہوئی آمدنی اپنی مرضی سے ان لوگوں پر خرچ کریں جو زندگی کی معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ مگر سرمایہ داری میں سودی کاروبار کے باعث ایسے ماحول کی کوئی گنجایش سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مدینہ اکنامکس کی طرح اشتراکیت میں بھی سود کی مکمل ممانعت ہے مگر قدرِ زائد کی منصفانہ تقسیم کا اشتراکی تجربہ اس لیے بُری طرح ناکام ہوگیا کہ یہ طریق کار غیرفطری تھا۔ وسائلِ پیداوار پر جبری حکومتی قبضہ اور ہر قسم کی الٰہیات اور اخلاقیات سے مکمل دُوری نے ثابت کر دیا کہ ایسے نظام کو دوام اور استحکام حاصل نہیں ہوسکتا۔

روسی ادیب مائیکل شولوخوف کی دو کتابیں (اور ذان بہتارہا اور کنوارے کھیت) اشتراکی نظام کی عملی کارکردگی پر بہت مؤثر انداز میں روشنی ڈالتی ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ اجتماعی ملکیت کے تصور کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ کمیون (Commune) سسٹم کے تحت گاؤں کے سارے گھوڑے اب سارے گاؤں کی ملکیت تھے۔ ناول میں ایک کسان کا ذکر ہے جو انقلاب سے پہلے ایک گھوڑے کا مالک تھا۔ انقلاب کے بعد اس کی ڈیوٹی فارم ہاؤس پر لگا دی گئی، جس میں سارے گاؤں کے گھوڑے رکھے جاتے تھے۔ اشتراکی فلسفہ پر لیکچر کے دوران اسے بتایا جاتا کہ اب وہ سارے گاؤں کے گھوڑوں کا مالک ہے۔ کسان کو اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کیونکہ اس کا تو اپنا گھوڑا بھی اس کی ملکیت میں نہیں رہا تھا، مگر گھاس ڈالتے وقت وہ زیادہ ہری گھاس اس گھوڑے کو ڈالتا جو کبھی اس کا اپنا ہوتا تھا۔ اگرچہ یہ ایک افسانوی واقعہ ہے مگر اس سے بہت بڑی حقیقت کا سراغ ملتا ہے کہ ملکیت کا تصور (sense of ownership) انسانی سرشت میں شامل ہے۔ انقلاب کے بعد دو نسلوں نے بڑی محنت سے کام کیا جس سے پہلے ۵۰ برسوں میں روسی معیشت نے

خوب ترقی کی۔ تیسری نسل میں محنت اور جانفشانی سے کام کرنے کے لیے کوئی جذبۂ محرکہ (motivation to work) موجود نہیں رہا۔ الہامی اور اخلاقی جواز کی نفی کے باعث اشتراکیت وہ جوش اور ولولہ قائم نہ رکھ سکی، جس سے مشترکہ خوش حالی وجود میں آتی ہے۔

یہاں یہ ذکر کرنا بہت ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے معاشیات منتشر حالت (fragmented) میں موجود تھی مگر معاشی نظام ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔ معاشیات کی تاریخ کے مطابق سرمایہ داری کا آغاز تو ایڈم سمتھ نے ۱۷۷۶ء میں کیا، جسے عام طور پر پہلا معاشی نظام کہا جاتا ہے۔ اس کے ۱۰۰ سال بعد کارل مارکس نے دوسرے معاشی نظام، اشتراکیت کی بنیاد رکھی۔ یہ صورتِ حال بہت بڑے سوال کو جنم دیتی ہے۔ کیا تینوں ابراہیمی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) معاشی نظام کے بغیر ہیں؟ حالانکہ تینوں مذاہب سرمایہ کا استعمال بطور سود کے بارے میں یکساں موقف رکھتے ہیں۔ یعنی سود تینوں مذاہب میں معاشی جدوجہد کا حصّہ نہیں ہے مگر تینوں مذاہب میں قرض (بغیر سود کے) کی گنجایش موجود ہے۔ تورات میں اپنے بھائی کی مشکل وقت میں مدد کرنے کو کہا گیا ہے۔ بائبل میں قرض دینے کے بعد اسے معاف کرنے (debt forgiveness) کا تصور بہت اہم ہے۔ بیان ہے کہ سات سال بعد اپنے بھائی اور دوست کا قرض معاف کر دیا جائے۔ بائبل میں اسے خداوند کی ادائیگی (Gods's Release) کے نام سے بیان کیا گیا ہے۔ اسلام میں یہی بیانیہ قرضِ حسن اور قُلِ الْعَفْوَ کے نام سے ہے۔ لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ سرمایہ داری انسانیت کا پہلا معاشی نظام ہے۔ تینوں مذاہب نے معاشی پہلوؤں پر بات کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں سود کو معاشی عمل کا حصّہ نہیں بنایا اور سود کے انسانی زندگی پر بُرے اثرات کی بات کی ہے۔ ۲۰۱۹ء میں چھپنے والی کتاب *Religion and Finance* میں سود کا ابراہیمی مذاہب کے تناظر میں ذکر کرنے کے بعد ۲۰۰۸ء کے مالی بحران کی بڑی وجہ سودی کاروبار کو بیان کیا ہے۔

حقیقت میں معاشیات اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسانی سماجی زندگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی شکلیں بدلتی رہیں۔ ابتدائی معاشی حالت کو ہم شکار چی دور (Hunter Gathere Age) سے جانتے ہیں جس میں خوراک اور پناہ گاہ ہی دو بنیادی مسئلے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں بہتری آتی رہی۔ منظم معاشرے اور حکومتیں وجود میں آئیں۔ ساتویں صدی میں دُنیا میں

ایران اور روم دو بڑی طاقتیں تھیں۔ ان ممالک کی معاشیات بھی بہت مضبوط تھی۔ بڑی بڑی تجارتی منڈیوں میں زرعی اجناس اور صنعتی اشیا کی خرید و فروخت ہوتی۔ عوام اور بادشاہ ضرورت کے وقت ساہوکاروں سے اُدھار لیتے۔ ملکیت کے تصور کو قبولیتِ عام کا درجہ حاصل تھا۔ تاجر کے پیشے نے تجارت کے فروغ کی نئی راہیں کھولیں۔ کرنسی کی ایجاد سے ادائیگیوں کے نظام میں بہتری آئی۔

معاشیات کے یہ بنیادی ستون تو موجود تھے مگر ابھی تک وہ معاشی قوانین اور ضوابط وجود میں نہیں آئے تھے، جنھیں ہم معاشی نظام کہہ سکیں، مثلاً مارکیٹ میں اشیا کی قیمتیں کیسے طے ہوتی ہیں؟ اکثر قیمتیں منڈی کی رسد اور طلب کے مطابق ہی ہوتی تھیں مگر حکومتی مداخلت عام تھی۔ قحط اور سیلاب کی صورت میں حکمران قیمتیں اپنی مرضی سے مقرر کرتے۔ سودی قرض کی واپسی بھی بادشاہ اور امرا کی منشا کے مطابق تھی۔ تجارت اور تاجر کے پیشے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ملکیت (زمین، جاگیر وغیرہ) کا عطا ہونا یا ضبط ہوجانا، بادشاہ کی خوشی یا ناراضی کے مطابق ہوتا۔ اسلام کے ظہور نے اس منتشر معاشیات کو قانون وضوابط عطا کر کے اسے ایک معاشی نظام میں منظم کر دیا، مثلاً تجارت کو معزز پیشہ قرار دیا اور تاجر کو معاشرے کا معزز ترین فرد بنادیا۔ قیمتوں کے تعین (determination of prices) کو ہر حال میں منڈی کی طلب اور رسد سے جوڑ دیا۔ سود کو منع مگر قرض کی ادائیگی کو لازمی کر دیا۔ ایمان داری اور فلاح کو تجارت کی بنیاد بنادیا۔ مارکیٹ میں اشیا کی خرید و فروخت پر ٹیکس ختم کر کے زکوٰۃ کا نظام متعارف کرایا۔ صاحبِ ثروت لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ان لوگوں کا بھی خیال کریں جو معاشی طور پر کمزور ہوں۔ یہ نظام قرآن میں نازل ہوا اور خود حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ساتویں صدی کی ریاستِ مدینہ میں نافذ کیا۔ اس طرح مدینہ اکنامکس دُنیا کا پہلا معاشی نظام ہے، جس میں دورِ حاضر کے معاشی نظام کے تمام اجزائے ترکیبی نہ صرف موجود ہیں بلکہ آج کے معاشی مسائل خاص طور پر 'مشترکہ خوش حالی' کا حل بھی دستیاب ہے۔

ساتویں صدی کی مدینہ اکنامکس کی بنیاد ایمانیات اور اخلاقیات پر ہے۔ یہ ترتیب قرآن کے دو الفاظ صلوٰۃ اور زکوٰۃ فراہم کرتے ہیں۔ دل چسپ بات ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں بھی یہی ترتیب ہے۔ سورۂ مریم میں حضرت عیسیٰؑ جو ایک دن کے بچے ہیں لوگوں کو بتاتے ہیں کہ ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اس نے مجھے نبی بنایا اور جب تک میں زندہ رہوں مجھے صلوٰۃ قائم کرنے

اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے‘‘۔ قرآن کی اس آفاقی ترکیب (صلوٰۃ اور زکوٰۃ) کو جب ساتویں صدی کی ریاستِ مدینہ میں نافذ کیا گیا تو ایک مثالی معاشرہ وجود میں آیا جس میں تجارت معاشی فلاح پھیلانے کا ذریعہ بن گئی اور لوگوں نے خود اپنی مرضی سے محنت اور ایمان داری سے کمائی ہوئی آمدنی سے ان لوگوں پر خرچ کیا جو معاشی طور پر کمزور تھے۔ قُلِ الْعَفْوَ کی یہی حقیقت ہے جس کے نمودار ہونے کے علامہ اقبال منتظر ہیں۔

قُلِ الْعَفْوَ اور دورِ حاضر

درج بالا بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ’مشترکہ خوش حالی‘ کے لیے ضروری ہے کہ معاشی نظام سود سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط اخلاقی اقدار پر مبنی ہو۔ دونوں مشہور معاشی نظام (سرمایہ داری اور اشتراکیت) مشترکہ خوش حالی کے درج بالا بنیادی لوازمات سے خالی ہیں۔ یہ اعزاز صرف ساتویں صدی کی مدینہ اکنامکس کو حاصل ہے، جس میں یہ دونوں عناصر بدرجۂ اتم موجود ہیں اور اس معاشی نظام کی بنیاد دانش و بُرہان پر ہے۔ پچھلے ۵۰ سال معاشیات کی تاریخ میں بہت اہم ہیں کیونکہ ان برسوں میں اشتراکیت اور سرمایہ داری بطورِ معاشی نظام اپنی چکاچوند (glitter and shine) کھو بیٹھے۔ ۱۹۹۱ء میں اشتراکیت کے خاتمے پر نظامِ سرمایہ داری کی افادیت اور فعالیت کے بڑے ترانے گائے گئے۔ ساری دُنیا کی معاشی قیادت سرمایہ داری کو سونپ دی گئی۔ اس بات کو بڑے متکبرانہ انداز میں بیان کیا گیا کہ سرمایہ داری ہی انسانیت کا اکلوتا معاشی نظام ہے جس سے معاشی فلاح کے چشمے پھوٹیں گے۔ ۲۰۰۸ء کے مالی بحران نے ان سارے دعووں کی نفی کر دی۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۸ء میں کہہ دیا تھا کہ کوئی معجزہ ہی اسے مکمل تباہی سے بچا سکتا ہے۔ علامہ اقبال تو اس سے پہلے ہی سرمایہ داری کے سفینے کے ڈوبنے کی بات کر چکے تھے۔ اس ماحول میں ضروری ہے کہ قُلِ الْعَفْوَ کی عالم گیر حقیقت کو آشکار کرنے کی کوشش کی جائے۔ ساتویں صدی کی مدینہ اکنامکس کو یونی ورسٹیوں میں پڑھایا جائے۔ اپنے نوجوانوں کو اسلام کی گمشدہ معاشی جنّت سے آگاہ کیا جائے کیونکہ اکیسویں صدی کی دُکھی انسانیت ایسے ہی معاشی نظام کی متلاشی ہے اور علّامہ اقبال بھی یہی چاہتے تھے:

خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نُورِ بصیرت عام کر دے